رضا علی عابدی کے سفر ناموں میں سماجی شعور

Social consciousness in Raza Ali Abidi's travelogues

سید وسیم شاہ [i]   ڈاکٹر الطاف یوسف زئی [ii]

Abstract:

There is a profound relationship between literature and society. A writer is an integral part of society, and societal behaviors and conditions influence the writer. Both the prosperity and the issues of a society impact a writer deeply. If the society is prosperous, the themes in a writer's work will reflect that prosperity. Conversely, if the society is beset with problems, those issues will undoubtedly be present in the writer's themes. A travelogue reflects a traveller's observations and experiences during their journey. It includes the knowledge, insights, experiences, and emotions gathered during the trip. Some travel writers choose to travel to encompass all possible topics related to a particular region, using their perceptive consciousness to pen down subjects that come within their understanding. Raza Ali Abidi, for instance, travelled from London to the Indian subcontinent for exploration as this region is his own. He was well-acquainted with its culture, society, history, and social dynamics. These themes were ingrained in his consciousness. During his travels, he keenly observed and documented these topics. There is a significant diversity of themes in Raza Ali Abidi's works, and his social consciousness is noteworthy.

Keywords: *Travelogue, Raza Ali Abidi, Social Consciousness, Behaviors, Trends, Education, Culture.*

ادب اور سماج کا گہرا رشتہ ہے۔ ایک مصنف معاشرے کا ایک لازمی حصہ ہے ، اور سماجی رویے اور حالات مصنف پر اثر انداز ہوتے ہیں. معاشرے کی خوش حالی اور مسائل دونوں ہی مصنف پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر معاشرہ خوش حال ہے تو مصنف کے موضوعات اس خوش حالی کی عکاسی کریں گے۔ اگر معاشرہ مسائل میں گھرا ہوا ہے تو بلاشبہ وہ مسائل مصنف کے موضوعات میں موجود ہوں گے۔ سفر نامہ مسافر کے سفر کے دوران ان کے مشاہدات اور تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں سفر کے دوران جمع ہونے والے علم ، بصیرت ، تجربات اور جذبات شامل ہیں۔ کچھ سفرنامہ نگار کسی خاص علاقے سے متعلق تمام ممکنہ موضوعات کو شامل کرنے کے لیے سفر کرنے کا انتخاب کرتے ہیں ، اور اپنے ادراک کے مطابق ان مضامین کو قلم بند کرتے ہیں جو ان کی دانست میں قابلِ تحریر ہوتے ہیں۔ رضا علی عابدی نے لندن سے برصغیر پاک و ہند کا سفر کیا کیوں کہ یہ خطہ ان کا اپنا ہے۔ وہ اس کی ثقافت ، معاشرت ، تاریخ اور سماجی حرکیات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ موضوعات ان کے شعور میں پیوست تھے۔ اپنے سفر کے دوران انھوں نے گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور تحریری صورت دی۔ رضا علی عابدی کی تخلیقات میں موضوعات کا نمایاں تنوع ہے اور ان کا سماجی شعور قابل ذکر ہے۔

کلیدی الفاظ: سفرنامہ ، رضا علی عابدی ، سماجی شعور ، رویے ، رجحانات ، تعلیم ، ثقافت۔

ادب اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ادیب سماج کا حصہ ہے۔ سماج اور سماجی رویے ادیب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ معاشرے کی خوشحالی اور مسائل دونوں ادیب کو متاثر کرتے ہیں۔ معاشرہ خوشحال ہے تو ادیب کے ہاں موضوعات بھی خوشحالی کی ترجمانی کریں گے۔ اگر معاشرہ مسائل سے دوچار ہے تو ادیب کے موضوعات میں ان کی شمولیت لازمی عمل ہے۔ سفر نامہ سیاح کے مشاہدات کا حاصل ہوتا ہے، جو وہ دوران

i اسکالر پی ایچ۔ڈی ، شعبہ اردو ، ہزارہ یونی ورسٹی ، مانسہرہ۔
ii ایسوسی ایٹ پروفیسر ، شعبہ اردو ، ہزارہ یونی ورسٹی ، مانسہرہ۔ (Corresponding Author)

سفر کرتا ہے۔ سفر کے دوران حاصل ہونے والی معلومات، مشاہدات، تجربات اور احساسات کا اظہار سفر نامہ کہلاتا ہے۔ دوران سفر ایک سیاح کی نظر وہاں کے جغرافیہ، تاریخ، سیاست، مذہب، تہذیب، تمدن اور معاشرت پر ہوتی ہے۔ ہر سیاح اپنا خاص نقطہ نظر اور شعور لے کر سیاحت اختیار کرتا ہے۔ دوران سفر وہ ان مخصوص موضوعات کو نظر میں رکھتے ہوئے مشاہدات کرتا چلا جاتا ہے۔ ادیب کا سماج کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی عناصر کا ادب میں شامل ہونا اور سماجی مسائل کی واضح جھلک ہونا کوئی اچنبے کی بات نہیں۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ادب کا سماج سے علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ ادب پر اس دور کے سماج کی تحریکات کا اثر پڑتا ہے اور عوام کے رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔[1]

اردو ادب میں بیشتر سفر نامہ نگار ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے خاص مطمح نظر کو سامنے رکھتے ہوئے سیاحت اختیار کی۔ سر سید احمد خان کے سفر نامہ مسافران لندن کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے لندن کی سیاحت وہاں کی تعلیم و تربیت، نظم و ضبط اور منظّم معاشرت کو دیکھنے کی غرض سے اختیار کی۔ اسی طرح مولانا حالی اور شبلی کے سفر ناموں میں بھی مخصوص نقطہ نظر دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ مسلمان سیاحوں نے زیارت حرمین شریفین کا شرف حاصل کیا اور اپنے اس سفر کے تجربات کو سفر ناموں کی صورت محفوظ کیا۔ ان سفر ناموں میں مذہبی موضوعات غالب ہیں۔ ادبیات میں سفر نامہ کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے مسعود حسن شہاب اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ ادبیات کی ایک نہایت مفید اور دلچسپ صنف ہے۔ جس کو دنیا کی تمام زبانوں میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس سے نہ صرف دنیا کے تاریخی اور جغرافیائی حالات، مذہبی، ثقافتی کوائف اور معاشرتی اور تمدنی خصائص کا پتہ چلتا ہے، بلکہ قوموں کے جذبہ ترقی پسندی کو بھڑکانے اور ان کے ذوقِ اصلاح پذیری کو تیز کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔[2]

کچھ سفر نامہ نگار ایسے ہیں جو خطے کے حوالے سے تمام ممکنہ موضوعات کا احاطہ کرنے کے لیے سیاحت اختیار کرتے ہیں اپنے حساس شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے ان موضوعات کو قلم بند کرتے ہیں جو ان کے شعور کی دسترس میں آجاتے ہیں۔ رضا علی عابدی لندن سے پاک و ہند کی سیاحت کے لیے عازمِ سفر ہوئے کیوں کہ یہ خطہ ان کا اپنا ہے اس لیے یہاں کی تہذیب و معاشرت، تاریخ اور سماج سے اچھی طرح

واقف تھے۔ اور یہ موضوعات ان کے شعور میں موجود تھے۔ وہ ان علاقوں کی سیاحت کے دوران ان موضوعات کو گرہ میں رکھ آگے بڑھتے رہے۔ رضا علی عابدی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ یہاں ان کے سماجی شعور کو خصوصیت دی جائے گی۔ انسان کی معاشرے میں رہنے کی شعور و آگاہی اسے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ اگر وہ اس سے نابلد ہے تو معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنے گا۔ ڈاکٹر محمد افضال لکھتے ہیں:

> سماجی شعور، سماجی آگاہی اور پہچان سے عبارت ہے۔ یہاں وہ تغیر و تبدل اہم ہے، جو ہمہ وقت کسی سماج میں جاری و ساری رہتا ہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماج کی عمومی اور خصوصی رویے اور منفی و مثبت سطح پر اس کے انفرادی زاویوں سے آگاہی بھی سماجی شعور کے دائرے میں آتی ہے۔[۳]

رضا علی عابدی کے سماجی شعور کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کے سفر ناموں کا مطالعہ کیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ سماجی رجحانات پر ان کی گہری نظر رہی ہے۔ لوگوں کے سماجی رویوں اور رجحانات کا دوران سفر رضا علی عابدی بہ غور مشاہدہ کرتے ہیں اور سفر نامے کی زینت بناتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں نوجوانوں کے رجحانات کیا ہیں؛ اس سلسلے میں رضا علی عابدی کے سفر نامے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> بابا نیلے آسمان تلے آرام فرما رہے تھے۔ کھلے ہوئے ہیں احاطے کے درمیان ان کی قبر تھی۔ برابر میں محرابیں بنی تھیں، جن پر کبھی سفیدی کی گئی ہوگی۔ مگر بعد میں درگاہ پر آنے والے نوجوانوں نے انڈے جیسی سفید دیواروں پر اپنے نام لکھ دیے شکور، ابرار شاہ، افتخار، ریاض، باغ علی، حبیب اقبال، عاجز، حامد شاہ، رئیس خان، امداد وغیرہ ان دل والوں نے نہ صرف اپنے نام لکھے بلکہ جن کو دل دے آئے تھے ان کے اسمائے گرامی بھی لکھ دیے نوشی، شائستہ وغیرہ۔[۴]

رضا علی عابدی کی گہری نظر دیواروں تک پر لکھے گئے ناموں کو عام لوگوں کی طرح نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ادیبانہ حساس طبیعت سے مجبور ہو کر نہ صرف نوجوانوں کے سماجی روجحانات کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مثال کے طور پر وہ نام بھی پیش کرتے ہیں جو وہاں لکھے گئے تھے، تاکہ قارئین اپنے سماجی رویوں پر غور و فکر کر سکیں۔ ہمارے سماج میں تعلیم کی کمی نے لوگوں کو جہالت کے اندھیرے میں

جھونک رکھا ہے اور اس جہالت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے پیروں نے اپنے ہتھکنڈے مضبوط تر کر لیے ہیں۔ اوپر سے لوگوں کی رجحانات ہیں جو انھیں مزید طاقت وَر بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں رضا علی عابدی کے سفر نامہ شیر دریا کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> میں اہل شہر سے تاریکی کی شکایت کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے زیادہ بھیانک تاریکی جہالت اور کم علمی کی ہے۔ ساری دنیا آگے نکلی جا رہی ہے، مگر میاں والی کی تحصیل عیسٰی خیل کا یہ سارا علاقہ جہل کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا جاگیر داروں نے دوبارہ رکھا ہے لوگوں کو؟ جواب ملا جی نہیں! یہاں پیروں فقیروں کا زور ہے۔ دو چار کو چھوڑ کر باقی سارے پیر ان پڑھ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہیں اور ان کا خون چوس رہے ہیں۔[۵]

پاکستانی سماج میں عوام کے رجحانات ایسے ہیں کہ تعمیر و ترقی کی کوئی سبیل نہیں۔ جو جیسا چاہے اپنا منصوبہ ان پر آزما سکتا ہے، اور اپنا مقصد پورا کر سکتا ہے۔ تاجر خواہ وہ کیسا بھی مال بیچ رہا ہو وہ ان لوگوں کے رجحانات سے واقف ہے، تو اپنا سودا بیچنے میں کامیاب ہے۔ رضا علی عابدی دوران سفر راول پنڈی کے عوام کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے تاسیفانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ گھروں کو توڑ کر فلیٹ، مارکیٹیں، پلازے اور دکانیں بنائی جا رہی ہیں۔ سڑک کے کناروں پر جہاں دیکھو دکانیں ہی دکانیں نظر آتی ہیں اور عوامی رجحان کچھ یوں ہے:

> ہر شخص کچھ نہ کچھ بیچ رہا ہے۔ جو بیچ نہیں رہا وہ کچھ نہ کچھ خرید رہا ہے۔ رات ٹیلی ویژن پر مہارانی ہیر آئل کا اشتہار آتا ہے۔ صبح سارا شہر مہارانی ہیر آئل خریدنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔۔۔ نپولین نے انگریزوں کے بارے میں کہا تھا کہ دکانداروں کی قوم ہے۔ نپولین دنیا میں دوبارہ آ جائے تو اپنے مقولے پر اسے نظر ثانی کرنا پڑے گی۔[۶]

رضا علی عابدی سماجی رسم و رواج کو بھی تحریر میں لاتے ہیں۔ جس خطے کی سیاحت کرتے ہیں وہاں کے رسوم و رواج پر مقامی لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں تاکہ وہاں کے رواج پوری طرح جان سکیں، اور ان کا موازنہ دوسرے خطوں کے رواج سے کر سکیں۔ جو رواج انھیں زیادہ پسند آتے ہیں وہ بڑے تپاک انداز میں انھیں سفر نامہ کی زینت بناتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے دوران انھیں شادی بیاہ

کی رسم و رواج میں ایک رواج بے حد پسند آیا اقتباس ملاحظہ ہو:

> یہاں جو جہیز دیتے ہیں وہ محض رسماً ہے۔ زیادہ بوجھ اصولاً لڑکے پر پڑنا چاہیے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ شادی زیادہ دھوم دھام سے نہیں ہوتی لڑکے والے معمولی سی دعوت دیتے اور اسے شادی کہتے ہیں۔ لڑکی کی ماں اپنے سر کی اوڑھنی لڑکی کو دے دیتی ہے اور اسے یہ لوگ جہیز تصور کرتے ہیں۔[۷]

جرنیلی سڑک رضا علی عابدی کے بہترین سفر ناموں میں سے ایک ہے۔ جی ٹی روڈ کا پرانا اور اصل نام جرنیلی سڑک تھا، جس کو انگریزوں نے بدل کر جی ٹی روڈ یعنی گرینڈ ٹرنک روڈ رکھ دیا۔ یہ سڑک شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی، جو پشاور سے لے کر کلکتہ تک پندرہ سو میل طویل ہے۔ رضا علی عابدی نے اس سفر نامے میں سڑک کے آس پاس موجود علاقوں کی سیاحت کی اور سفر نامہ کو جرنیلی سڑک کا نام دیا۔ شیر شاہ سوری کو سماجی حوالوں سے خوب جانا جاتا تھا۔ سڑک بنانے کی دوسرے کئی مقاصد شیر شاہ سوری کی نظر میں ہوں گے، مگر اس کا سب سے بڑا مقصد سماجی فلاح تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے سڑک کے ارد گرد گاؤں بسائے تاکہ وہ اس سڑک کی حفاظت کر سکیں اور سڑک پر آنے جانے والے قافلوں کی خدمت کے ساتھ حفاظت بھی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر سرائیں اور بولیاں بنوائیں تاکہ سفر کرنے والوں مشکلات سے بچایا جاسکے۔ اس طرح شیر شاہ نے ڈاک کا نظام قائم کیا، تاکہ لوگوں کا آپس میں رابطہ باآسانی ہو سکے۔ اس تمام سماجی اور فلاحی ڈھانچے کو رضا علی عابدی نے باریک بینی سے مشاہدہ کر کے سفر نامہ کی زینت بنایا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> اس نے سترہ سو سرائیں بنوائیں۔ ایک کوس کے فاصلے پر ایک سرائے ہوتی تھی۔ یہ اہتمام صرف جو جی ٹی روڈ پر نہیں بلکہ ملتان، خندیش اور چتوڑ جانے والی سڑکوں پر بھی سرائیں تھیں۔ ان میں کھانے کے وقت ہر مسافر کو کھانا ملتا تھا۔ بیماروں اور زخمیوں کا مفت علاج ہوتا تھا۔ سرائے میں طبیب مقرر ہوتے تھے، وہاں آنے والے تمام مسافروں کے ناموں کا اندراج ہوتا تھا۔ دو کاتب ہوتے تھے۔ ایک ہندی میں لکھتا تھا اور دوسرا فارسی میں۔ مسافروں کے تمام کوائف لکھے جاتے تھے۔ ان کے مویشیوں کو خوراک دی جاتی تھی جس طرح مسافروں کو خوراک دی جاتی تھی۔[۸]

رضا علی عابدی نے ان سماجی اچھائیوں کو سفر ناموں کا حصہ بنایا ہے جو سماج میں مثبت تبدیلی کا باعث بنی ہیں۔ سماجی مسائل پر بھی رضا علی عابدی کی گہری نظر رہی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ان سماجی رویوں پر بھی بات کی ہے جن کی بدولت معاشرے میں منفی رویوں نے جنم لیا ہے۔ نہ صرف بڑے ان سے متاثر ہوئے بلکہ بچے بھی بے حد متاثر ہوئے اس سلسلے میں جرنیلی سڑک کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> پشاور میں اُن دِنوں گفتگو کا انداز خوب تھا جب بھی کسی سے بات کی ذرا دیر بعد اس میں افغان پناہ گزین، ہیروئن، روسی فوج اور کلاشنکوف رائفل کا ذکر ضرور آگیا۔ ایک سکول کے استاد مجھے بتا رہے تھے کہ جماعت میں بچے اپنے ساتھ پلاسٹک کی رائفل کے کھلونے لاتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ قصہ ہر گھر کا ہے کہ بچہ ایک روز مچل گیا کہ اسے فوراً سامنے والی دکان سے کلاشنکوف رائفل دلائی جائے ورنہ وہ گھر چھوڑ کر علاقہ غیر میں کسی خرکار کے کیمپ میں چلا جائے گا۔[۹]

رضا علی عابدی نے مشرقی معاشرے میں بڑھتی ہوئی سماجی پستی اور مشرقی اقدار اور روایات کے خلاف عوامی لاشعوری کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اپنی روایات کو کسی صورت مجروح نہیں ہونے دینا چاہیے اگرچہ مقصد کوئی بھی ہو۔ رضا علی عابدی معاشرے میں پھیلتی ہوئی اس بد نظمی کو اور سماجی پستی کو جرنیلی سڑک میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> سڑک کی دونوں طرف ہوٹلوں کے لاؤڈ سپیکر ہیں جن پر دن رات فلمی گانے بجا کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے مالکوں کا خیال ہے کہ جس کے لاؤڈ سپیکر کی آواز زیادہ اونچی ہو گی اس کے ہاں گاہک بھی زیادہ آئیں گے۔[۱۰]

جہازی بھائی رضا علی عابدی کا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے ماریشس کے سفر کا احوال قلم بند کیا ہے۔ ماریشس میں انسانوں کو غلام بنایا گیا، غلامی کی یہ داستان بڑی بھیانک ہے۔ رضا علی عابدی نے ماریشس میں سیاحت کے دوران نہ صرف ماریشس کے حالات حاضرہ کو اپنا مواد بنایا، بلکہ ان کی نظر ماریشس کی ماضی پر بھی تھی اور اُس وقت کی معاشرت پر بھی تھی۔ جب ہندوستانیوں کو ہندوستان سے ماریشس لا کر غلام بنایا جاتا تھا اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔ اس وقت ماریشس کا سماجی ڈھانچا کیسا تھا اور وہ کون سے مسائل تھے جو اہلِ ماریشس کو درپیش تھے۔ انصاف کو سماج کی اہم کڑی سمجھا جاتا ہے۔ ماریشس میں انصاف کے حوالے

سے رضا علی عابدی اپنے سفر نامہ میں یوں بیان کرتے ہیں:

> اگر شامت کا مارا کوئی مزدور اپنے آقا کی شکایت کرنے دارالحکومت چلا جاتا تو سب سے پہلے اُسے قید خانے ڈال دیا جاتا تھا، جہاں اسے اپنے آقا کے آنے تک رہنا پڑتا تھا۔ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ گورا آقا آتا تو مجسٹریٹ صاحب بہادر اس کی پوری کتھا سنتے تھے، اور مزدور کی بپتایوں بھی کیسے سنتے کیوں کہ وہ غریب بھوج پوری بولتا تھا یا پھر تامل یا مرہٹی۔ کتاب میں لکھا ہے کہ مظلوم اپنی بات کیے جاتا تھا اور کوئی اہلکار ایسا بھی نہ تھا جو مجسٹریٹ کو اس کی بات کا مطلب سمجھا دے آخر گورا آقا سرخرو ہوتا تھا۔"

شیر دریا رضا علی عابدی کا ایسا سفر نامہ ہے جس میں رضا علی عابدی نے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کیا اور دریا کے آس پاس موجود علاقوں کی سیاحت کی۔ وہاں کی تہذیب و معاشرت کا مشاہدہ کیا ہے۔ شمالی علاقوں میں بسنے والوں کی ثقافت کا رنگ رضا علی عابدی نے خود بھی محسوس کیا اور اپنے قارئین کے لیے بھی اس کا اہتمام کیا۔ ایک اقتباس میں وہ شمالی علاقہ جات کی خواتین کے لباس کے بارے میں بیان کرتے ہیں، جس سے ان کے سماجی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

> لباس ان کا بہت ہی پرانے انداز کا ہے۔ چھپے ہوئے کپڑے کے بڑے بڑے گھگھرے پہنتی ہیں۔ کپڑا یہیں کا لوکل ہوتا ہے، جس پر ٹھپے کی چھپائی ہوتی ہے۔ ان کی شلواریں بہت گھیر والی ہوتی ہیں۔ تقریباً نو گز کی شلوار بنتی ہے۔ سر پر ٹوپی ہوتی ہے۔ ہر عورت کے سر پر ٹوپی ضرور ہوتی ہے۔ اس ٹوپی پر کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ غریب عورتوں کی ٹوپی پر معمولی کام بنا ہوتا ہے اور امیر عورتوں کی ٹوپی پر چاندی کے سکے اور موتی لگے ہوتے ہیں۔ موتیوں کا رواج بہت زیادہ ہے۔ ہر دلہن کے گلے میں موتیوں کی مالائیں بھری ہوتی ہیں۔ تقریباً بیس کے جی کے ہار ڈالتی ہیں، گلے میں۔ پھر کشیدہ کاری بھی گھریلو ہوتی ہے اور بہت مشکل اور محنت طلب ہوتی ہے۔"[۱۲]

تعلیم سماج کا ضروری عنصر ہوتا ہے۔ سماج میں تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رضا علی عابدی اپنے سفر نامہ ریل کہانی میں ریل کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور ریلوے لائن کے ارد گرد موجود علاقوں کی سیاحت کرتے ہیں۔ دیگر سماجی عناصر کے ساتھ تعلیم پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور سفر نامہ کی زینت بناتے

ہیں۔ سفر نامہ ریل کہانی میں رضا علی عابدی جن علاقوں کی سیاحت کرتے ہیں وہاں کے لوگوں سے مختلف سماجی مسائل اور عناصر پر بات کرتے ہیں۔ تعلیم بھی ان کے موضوعات میں سے ایک ہے، جس پر وہ علاقے کے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔ نہ صرف مردوں کی تعلیم بلکہ عورتوں کی تعلیم کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ریل کہانی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ہم نے شعبہ تعلیم کے اسٹال پر جدید کمپیوٹر دیکھا، جس کے بٹن دبانے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بلوچستان کے کسی علاقے میں کتنے سکول ہیں۔ کتنے سکولوں کی اپنی عمارتیں ہیں۔ یہاں تک کہ کتنی عمارتوں کی چھتیں نہیں ہیں۔ اس کمپیوٹر سے پہلی بار پتہ چلا کہ بلوچستان میں لڑکیوں کی تعلیم کی دنیا میں انقلاب آ رہا ہے، اور والدین پہلی بار بچیوں کو سکول بھیجنے لگے ہیں۔"[۱۳]

رضا علی عابدی تعلیم کو خاص توجہ اور اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور اپنے سفر ناموں میں جا بجا اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر قلیوں سے ملاقات کے دوران ان سے بات چیت کرتے ہوئے ان کی تعلیم کے بارے میں رضا علی عابدی سوال کرتے ہیں۔ ان کا جواب جاننے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں ایک اقتباس ملاحظہ کریں جو رضا علی عابدی کی بصیرت کو نمایاں کرتا ہے کہ معاشرے کے لیے تعلیم کتنی اہم ہے:

> صرف چھے جماعتوں کی تعلیم نے ان کے لب و لہجے کو کتنا مہذب بنا دیا تھا۔"[۱۴]

رضا علی عابدی کا گہرا مشاہدہ معاشرے کے انگ انگ کو بغور دیکھتا ہے۔ سماجی رویوں اور بلاضرورت کیے جانے والے عوامل پر اپنے فکر و شعور کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ معاشرے کے لوگوں کی احساس کمتری کو اجاگر کرتے ہیں اور اس سماجی احساس کو جو مشرقی عوام میں پنپ رہا ہے، سفر نامہ کا حصہ بناتے ہیں۔ مشرقی سماج میں لوگوں کی احساس کمتری نے زبان کا دامن بھی ان سے چھڑا دیا ہے۔ وہاں بھی اپنی زبان کی بجائے دوسروں کی زبان بولتے ہیں جہاں اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اپنے ہی لوگ آپس میں اغیار کی زبان بولیں تو رضا علی عابدی کو تعجب کیوں نہ ہو؟ سفر نامہ جرنیلی سڑک سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> دلّی کے ہوٹلوں کا یہ ایک عجیب رواج ہے ہوٹلوں کے اندر سب انگریزی بولتے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ ہندوستان بھر کے لوگ یہاں آتے ہیں اور ان کی مشترکہ زبان ہندی نہیں انگریزی ہے۔[۱۵]

شیر دریا میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے دوران قبائلی باشندوں کی صدیوں سے چلی آرہی روایات پر بھی بات کرتے ہیں۔ ان روایات میں کچھ شادی بیاہ سے متعلق ہیں۔ خاص کر بچیوں کی شادی سے متعلق پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی انوکھی روایات ہیں، جو شاید ہندوستان اور پاکستان میں صرف ان ہی خطوں سے وابستہ ہیں۔ اس انوکھی روایت کو ایک اقتباس کے ذریعے واضح کرتا ہوں:

> لڑکی کی بہت کم عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ وہ گیاراں، بارہ یا تیرہ کی ہوئی تو اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ شوہر کی عمر بھی اتنی ہی ہوتی ہے اور کبھی بڈھا ہوتا ہے۔ غریب لوگ زیادہ تر اپنی لڑکیوں کی شادی بڈھوں سے کرتے ہیں۔ لڑکی والے شادی سے پہلے کچھ پیسے لیتے ہیں۔ جہیز دینے کا یہاں کوئی رواج نہیں البتہ شادی سے پہلے لڑکے سے رقم لیتے ہیں۔ امیر آدمی زیادہ پیسہ لیتا ہے۔ غریب آدمی تھوڑے پیسے لیتا ہے، پھر اس سے لڑکی کو کچھ معمولی سادے کر رخصت کرتے ہیں۔[۱۶]

دیگر سماجی سرگرمیوں کے ساتھ کھیل بھی ایک اہم سماجی سرگرمی ہے، جو سماج کی بہترین ذہنی اور جسمانی نشونما کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کھیل سماج کا حصہ ہونے کے ساتھ رضا علی عابدی کے سفرناموں کا بھی حصہ ہے۔ رضا علی عابدی سماج میں موجود ہر چیز جس پر ممکن ہو سکے نظر رکھتے ہیں، ان کی یہی نظر ان کے سماجی شعور کو پختہ کرتی ہے۔ شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے دوران مشہور کھیل جو دنیا بھر میں صرف اس خطے سے مخصوص ہے، کو اپنے سفرنامہ میں جگہ دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> پولو تو مسلمان لائے ہیں جب سے مسلمان یہاں آئے ہیں خصوصاً اس شہر میں مسلمانوں کے آنے کے بعد پولو شروع ہوا ہے۔ مسلمانوں کے ہر گاؤں میں ایک میدان ہوتا ہے جسے شگرن کہتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پولو ابھی ماضی قریب تک مقابلے کا کھیل نہیں تھا، بلکہ ملاقات کی تقریب تھی۔ جب کسی کے پاس اچھا گھوڑا ہوا وہ گھوڑے پر چڑھ آیا اور ڈنکے پر چوٹ پڑی اس آواز کو بھم کہتے ہیں۔ یہ اطلاع ہوتی ہے کہ صاحب پولو شروع ہونے والا ہے۔ ادھر تین بھم ہوئے ادھر لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر آئے اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر پولو کھیلنے لگے۔ اس کھیل کے خاص ضابطے بھی نہیں تھے۔ کھلاڑیوں کی تعداد بھی مقرر نہیں تھی۔ میدان کی لمبائی چوڑائی کا بھی کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر اب لوگوں نے کافی ترقی کر لی ہے۔ کچھ قوانین بن گئے ہیں کچھ

قاعدے بن گئے ہیں اور لوگ آج پہلے سے بہت ہی بہتر پولو کھیل رہے ہیں۔[۱۷]

رضا علی عابدی کے سفر ناموں میں سماجی شعور سماج پر ان کی گہری نظر اور مشاہدے پر دلالت کرتا ہے۔ سیاحت کے دوران رضا علی عابدی علاقے کا سماجی حوالوں سے جائزہ لیتے ہیں۔ وہاں کا مذہب، تہذیب و تمدن، رسم و رواج، رہن سہن، تعلیم، روایات، مثبت و منفی رویے، ثقافت، زبان، کھیل، مشاغل، عقائد، نظریات، عدل و انصاف اور فلاح و بہبود جیسے سماجی موضوعات ان کی نظر میں رہتے ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں ان کی نظریں مذکورہ بالا کو ٹٹولتی رہتی ہیں۔ رضا علی عابدی کے سفر ناموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خطے کے لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں اور ان کے مکالموں کو بھی سفر ناموں کی زینت بناتے ہیں۔ ان مکالمات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ سیاسی نفسیاتی اور تاریخی شعور کے ساتھ سماجی شعور بھی موجود ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ (لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۶ء)، ۳۰۔
۲۔ مسعود حسن شہاب، ''حرفِ آغاز''، مشمولہ: سہ ماہی الزبیر، نمبر ۵ (بہاول پور: اردو اکادمی، ۱۹۶۲ء)۔
۳۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۔
۴۔ رضا علی عابدی، شیر دریا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۱۳۰۔
۵۔ ایضاً، ۱۳۸۔
۶۔ رضا علی عابدی، جرنیلی سڑک (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۵۴۔
۷۔ رضا علی عابدی، شیر دریا، ۱۸۔
۸۔ رضا علی عابدی، جرنیلی سڑک، ۱۹۔
۹۔ ایضاً، ۲۵۔
۱۰۔ ایضاً، ۴۲۔
۱۱۔ رضا علی عابدی، جہازی بھائی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء)، ۳۸۔
۱۲۔ رضا علی عابدی، شیر دریا، ۴۷۔
۱۳۔ رضا علی عابدی، ریل کہانی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۴۲۔
۱۴۔ ایضاً، ۱۰۳۔
۱۵۔ رضا علی عابدی، جرنیلی سڑک، ۱۸۰۔
۱۶۔ رضا علی عابدی، شیر دریا، ۷۵۔
۱۷۔ ایضاً، ۱۸۔